حیاتِ قادر

مؤلف

عبید اللہ دُرّانی

باب نمبر ۱۴

کرامات

حق کو منوانا بڑا دشوار ہے۔ مسیح علیہ السلام نے مُردے تک زندہ کئے مگر آخر صلیب پر لٹکا دیئے گئے۔ ہر پیغمبر کو حق نے ایک نہ ایک معجزہ عطا فرمایا تھا۔ تاکہ اگر روزمرہ اصول فطرت سے ہٹی ہوئی چیز ان بندگانِ خدا کے ذریعہ ظہور میں آئے تو کم از کم اس کے مشاہدہ سے ہی لوگ حق کی طرف رجوع ہوں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی حیات مظہرہ میں ان معجزوں سے بہت کنار فرماتے تھے۔ کیونکہ انہیں دین فطرت کو نشر کرنا تھا۔ اور خود فطرت ہی کے معجزہ کی طرف بار بار توجہ دلاتے تھے۔ سورۃ ''الرحمن'' کو دیکھئے خالق خود کسی رمز سے اس نظم و نسق کی طرف وجہ دلاتا ہے۔ رسول کریمؐ کا ارشاد ہے کہ میری اُمت میں ایسے افراد پیدا ہوں گے جو بنی اسرائیل کے نبیوں پر سبقت لے جائیں گے۔ یہی ودیعت بندگانِ خاص میں کرامت کہلاتی ہے۔ کرامت کیا چیز ہے۔ خدا کی ذات حیّ القیوم اور لفظ کن فیکون ایک تاریخی واقعہ ہی نہیں بلکہ ایک زندہ سلسلہ ہے جو جاری ہے۔ جب مشیت بندہ کی زبان بن جاتی ہے تو اس کی زبان سے جو نکلتا ہے وہی ہوتا ہے۔ اس کے لئے نہ سامان کی ضرورت ہوتی ہے نہ اسباب کی۔ مگر سالکِ کامل ظاہری عالم اسباب کا بہت لحاظ رکھتے ہیں اور صرف اس وقت جب حق جوش زن ہو تو حق کا نام بلند کرنے کے لئے کوئی کرامت دکھاتے ہیں۔ فیض اور چیز ہے۔ یہ ایک پھل کی خوشبو ہے۔ جس سے ہر ایک مستفید ہوتا ہے۔ ذیل میں چند کرامتوں کا ذکر ہے۔ جو حضور بابا جان سے اسی جوشِ حق کے عالم میں ظہور پذیر ہوئیں۔

بارش:

یہ اس زمانہ کا واقعہ ہے جب حضور بابا جان ناگپور سے بابا تاج الدینؒ سے حکم لے کر وجے نگرم کی بھیانک چٹانوں میں قیام فرما تھے۔ اس زمانہ میں آپ سرخ جوگئے لباس میں ملبوس رہتے تھے اور سوکھے کانٹے کی طرح ہڈی اور پوست ہو چکے تھے۔ جذب و جلال کا یہ عالم تھا کہ ان کے بچپن کے ساتھی بھی پیچھے ہی پیچھے رہتے تھے۔ سامنے آنے کی تاب نہ رکھتے تھے۔ کئی سال سے بارش نہیں ہوئی تھی۔ سارے تالاب اور کنوئیں خشک ہو گئے تھے۔ مردہ مویشیوں کی ہڈیوں کے ڈھیر کے ڈھیر ہر طرف پڑے نظر آتے تھے۔ گرمی اور دھوپ کا یہ عالم تھا کہ پتوں کا کیا ذکر درختوں کے تنے تک سوکھ چکے تھے۔ مائوں کا دودھ سوکھ گیا تھا۔ ننھے بچے بلک

بلک کر نیم غفلت میں پڑے رہتے تھے۔ میدانوں میں نمازیں پڑھی گئیں۔ مندروں میں گھی کے اگن جلائے گئے اور کیا کیا نہیں کیا گیا مگر اللہ الصمد اس بے نیاز کو کون منائے اور کس کی آواز اس تک پہنچے۔

شہر کے لوگ جمع ہوئے۔ ان لوگوں نے سُن لیا تھا کہ بستی کا ایک لڑکا ناگپور سے فقیر بن کر آیا ہے اور کالے تالاب کے قریب کی چٹانوں میں پڑا رہتا ہے۔ ان لوگوں نے سُن رکھا تھا کہ عشق ایک ایسی چیز ہے جو کبریا کے جلال کو بھی تسخیر کر لیتا ہے۔ شہر کے سارے لوگ عالم اور مولوی، بڑھے اور جوان اور بچے سب حضور بابا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے خدا کے پیارے ہمارے گناہوں کو معاف کرائو۔ رحم و کرم کے لئے سفارش کرو۔ خدا کے غضب کی تاب ہم میں نہیں ہے۔ بارش کے لئے دعا کیجئے۔ بابا صاحب نے فرمایا کہ کل دن کے بارہ بجے سب لوگ آئو، میں نماز استسقا پڑھائوں گا۔ اگلے روز سب لوگ جمع ہوئے۔ وہی سرخ لباس تھا اور سر برہنہ تھا۔ نماز پڑھائی اور دعا کی۔ لوگوں کے واپس جانے سے پہلے کہا کہ اگر بہت زیادہ بارش ہو تو شکایت نہ کرنا۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ اصولاً بھی بارش ہونے میں ایک مہینہ کی دیر تھی۔ نمازی سب گھر لوٹ گئے۔ گرمی اور بڑھ گئی۔ دوسری دن بارہ بجے تک سورج کی وہ تپش تھی کہ لوگ الامان والحفیظ چلاتے تھے اور ایک دوسرے سے پوچھتے تھے کہ کیا سورج سوا نیزہ پر اُتر آیا ہے۔ کیا اسی کو قیامت کہتے ہیں۔ مگر دن کیا ڈھلنا شروع ہوا کہ فضا یکلخت بدلنے لگی۔ کالے کالے بادلوں اور بجلی نے آگھیرا۔ دیکھتے دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ جیسے آسمان کی کھڑکیاں کھل گئی ہوں۔ آٹھ دن تک یہی سلسلہ رہا۔ تالاب جل تھل ہو گئے۔ کنوئیں لبریز۔ ندی نالے سب بھرپور۔ تالابوں کے بند ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہونے لگا۔ کچے مکان بیٹھنے لگے۔ کچھ لوگ پھر بابا جان کے پاس پہنچے اور عرض کی کہ بابا جان ہماری پیاس بجھ گئی۔ اب ان آسمانوں کو تھامئے۔ بابا جان نے کیف و مستی میں مسکراتے ہوئے آسمان کی طرف آنکھیں اُٹھا کر دونوں ہاتھ اپنے سر پر رکھے۔ تھوڑی دیر بعد اپنی جھونپڑی میں چلے آئے۔ لوگ اپنے اپنے مکانوں کو لوٹ گئے۔

بارش آہستہ آہستہ کم ہو گئی۔ اور اگلے دن صبح مطلع بالکل صاف تھا۔ کائنات کا ذرہ ذرہ خاموش نظر آتا تھا۔ زمین جو سوکھ کر جگہ جگہ سے پھوٹ گئی تھی اس میں آج ایک مادرانہ خوشبو اور جذبہ خدمت نظر آتا تھا۔ سوکھی ڈالیاں اب بھی سوکھی تھیں لیکن خدا جانے چڑیاں اور پرندے ان پر کہاں سے آکر بیٹھ گئے اور پیار کے گیت گانے لگے۔ بچے خوش خوش کاغذ کی نائو بنا کر بہتے پانی میں کھیلنے لگے۔ وہی سورج جو کل تک مجسم غیظ و غضب تھا۔ آج ایک شفیق باپ کی طرح اپنی شفاف کرنوں سے فضا کو نکھار رہا تھا۔ مگر دنیا۔ اَے دنیا تو بھی عجیب ہے۔ چار دن نہیں گزرنے پاتے جب مصیبت دُور ہو جاتی ہے تو تو اپنے محسن کو بالکل بھول جاتی ہے۔ وہی

لوگ جو چند دن بیشتر الامان الحفیظ چلا رہے تھے، آج آپس میں یہ باتیں کر رہے ہیں کہ بارش تو ہونی ہی تھی۔ اس فقیر نے کیا کیا۔ جب گرمی حد کو پہنچ جایا کرتی ہے تو بارش لازمی ہوا کرتی ہے۔ اس میں کرامت کون سی ہے۔ اللہ رحم کرے۔ انسان کتنا جاہل اور ظالم ہے۔

بارش کی چھتری:

سنہ ۱۹۳۰ء کا واقعہ ہے۔ قبلہ باباصاحب کو ان پہاڑیوں میں آکر کر بیٹھے ہوئے ابھی دس سال کا عرصہ گزرا تھا۔ فقیروں کا کسی جگہ بیٹھ جانا یا قیام کرنا ایک خاص معنی اور اہمیت رکھتا ہے۔ اکثر فقرا کو بذریعہ بشارت یا زبانی بوقت ملاقات حکم ملتا ہے کہ تم فلاں مقام پر جا کر بیٹھو۔ یہ جگہ عموماً دینی اور دنیاوی اعتبار سے اس قدر ناموزوں اور صبر آزما ہوتی ہے کہ صرف ایمان ہی کی طاقت اس فقیر کو وہاں قائم رکھ سکتی ہے۔ یہ ہی حال میٹے کا تھا (جو اس وقت باباجان کی موجودہ جائے قائم ہے) سر شام سے ہی لوگ اس طرف آنا جانا بند کر دیتے تھے۔ علاوہ درندوں اور سانپ بچھوئوں کے یہ جگہ ایسی ہولناک تھی کہ پتھر جیسے دل والے اِدھر آنے سے ڈرتے تھے۔ جنوں اور بلائوں کی جو وارداتیں اس جگہ آئے دن سُننے میں آتی تھیں۔ ان کی تفصیل خود ایک دفتر ہے۔

قبلہ باباصاحب کو بذریعہ بشارت اس جگہ پر بیٹھنے کا حکم دیا گیا تھا۔ چنانچہ آپ ان ہی چٹانوں میں جا کر بیٹھ گئے تھے اور ہمیشہ غرق اور مشغول رہتے تھے۔ شہر کے لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ کوئی فقیر ان ہولناک چٹانوں میں بیٹھا ہوا ہے تو وہ یہ سوچ کر یہ کام کوئی زبردست شخص ہی کر سکتا ہے۔ دو دو چار چار کر کے دنیاوی اغراض کے حصول کے لیے باباصاحب کے پاس آنے لگے۔ شروع شروع میں آس پاس کی بستیوں کے سادہ مزاج لوگ آتے اور اپنی امیدوں کا پھل پا کر لوٹ جاتے۔ آہستہ آہستہ شہرت بڑھتی گئی۔ تھوڑے ہی فاصلہ پر ایک باغ میں جٹا جوگی نامی ایک سادھو بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے حضرت سے مقابلہ کیا۔ لیکن اسے شرمندہ اور ذلیل ہو کر اپنی جگہ چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ یہ بات برہمنوں کو بہت ناگوار گذری۔ مگر انہوں نے نہایت دانشمندی سے کام لیا اور مردِ کامل کی جتنی نشانیاں ان کی پرانی کتابوں میں لکھی تھیں باباصاحب قبلہ میں تلاش کرنی شروع کر دیں۔ وہ لوگ آخری نشانی جو صرف اوتار کی ہوتی ہے یعنی پیروں میں سنکھ اور چکر کا ہونا دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے تھے۔ اس کے بعد ہر قسم کے دیدانت، مالدار، غریب غرض ہر قسم اور ہر مذہب وملت کے لوگ دور دور سے آنے لگے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ صبح اور شام کے وقت ہزار ہزار لوگوں کا مجمع بابا صاحب کے درشن کے لیے آیا کرتا تھا۔ باباصاحب کسی سے بات نہ کرتے تھے۔ جھونپڑی سے باہر بھی صرف چند منٹ کے لئے آتے تھے اور زیارت سے فیضیاب کر کے واپس چلے جاتے تھے۔

ہوتا چلا آیا ہے کہ برہمن قوم اس ڈر کے مارے کہ ان کو کوئی نقصان نہ پہنچے سر تو جھکا ہی دیتی ہے اور ہاتھ باندھے بھی کھڑی رہتی ہے تاکہ کچھ دنیا کے ٹکڑے انہیں بھی مل جائیں مگر یہ قوم ہے جو بدھ اور کبیر کو بھی گھول کر پی گئی۔ ان کی ذہانت کو ایک نئی ترکیب سوجھی کہ بابا صاحب کو آزمائش میں ڈالیں۔ اور انہیں شرمندہ کریں۔

اندھرا کے ساحل پر بارش کے موسم میں ایک ہفتہ ایسا ہوتا ہے کہ موسلا دھار بارش ہوتی ہے۔ جو تشی لوگ اس ہفتہ کا صحیح اندازہ رکھتے ہیں۔ ۱۹۳۰ء کا بھادوں کا زمانہ تھا اور اگلے دن وہ ہفتہ شروع ہونے والا تھا کہ برہمنوں کی ایک بڑی ٹولی نے آکر بابا صاحب سے عرض کی کہ ہم لوگ سب مل کر آپ کی شان میں ایک بہت بڑی نیاز کرنا چاہتے ہیں۔ آپ اجازت دیں تو ہم اسے پورا کریں۔ بابا صاحب نے فرمایا کہ کب کرنا چاہتے ہو۔ انہوں نے کہا کہ سامان جمع کرنے میں تین دن لگ جائیں گے چوتھے دن کی اجازت دیں۔ انہیں معلوم تھا کہ بابا صاحب کو دنیا کی چیزوں میں ایک چیز بہت پسند ہے اور وہ غریبوں کو کھانا کھلانا۔ بھلا وہ اس درخواست کو کیسے نامنظور یا ملتوی کرتے، اجازت دے دی۔ برہمنوں نے جتاجتا کر پوچھا کہ کیا آپ کی اجازت پکی ہے۔ بابا صاحب نے انہیں یقین دلایا کہ ہاں تم پورے طریقہ سے انتظام کرلو۔

وہ لوگ اٹھارہ من چاول، ترکاریوں کی گاڑیاں، پکانے کی دیگیں، جلانے کی لکڑی اور دیگر سامان لے کر مقررہ وقت پر میٹے یعنی بابا صاحب کی جگہ پہنچ گئے۔ میٹے میں اس زمانہ میں کوئی مکان اور جھونپڑی تو کُجا ایک بڑ کے درخت کے علاوہ کوئی سایہ تک نہ تھا۔ انہیں چٹانوں کے درمیان چولھے بنائے گئے اور دیگیں چڑھادی گئیں۔ شہر میں منادی کردی گئی تھی، کثیر خلقت نیاز میں شرکت کے لئے موجود تھی اُدھر دیگیں چولہے پر رکھی ہیں ادھر آسمان کے دروازے کھل گئے۔ کالے کالے بادل جو تشیوں کے حساب سے بالکل صحیح وقت گھر کر آئے اور موسلا دھار بارش کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ برہمن دل میں بہت خوش تھے مگر چھوٹا سا منہ بنائے بابا صاحب کے پاس پہنچے کہ حضور کیا ہوگا۔ بابا صاحب کھڑے ہوگئے۔ سر پر ہاتھ باندھے ہوئے تھے۔ مشرق کی طرف رُخ کیا تو دیکھا کہ بارش کی ایک دیوار ہے جو اِدھر کو بڑھی چلی آرہی ہے۔ شام ہوچکی تھی۔ علاوہ عام لوگوں کے پانچ سو سے زیادہ برہمن اور پنڈت موجود تھے جو بابا صاحب کی رسوائی دیکھنا چاہتے تھے۔ مگر اللہ جل شانہٗ کو اپنے پیارے کی رسوائی کب منظور تھی۔ بارش کی دیوار تو بڑھتی چلی آئی۔ مگر لوگوں نے یہ دیکھا کہ حجرہ سے ایک ڈیڑھ فرلانگ تک چاروں طرف بارش نہ تھی اور اس حصار کے باہر آسمان سے ایسا پانی برس رہا جیسے بالٹیاں لوٹی جارہی ہوں۔ لوگ ششدر اور متحیر تھے۔ ڈیڑھ گھنٹہ تک یہ سلسلہ رہا۔ اس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے بارش رُک گئی۔ برہمن ہاتھوں میں لیمپ لے کر چاروں طرف تفتیش کرنے نکلے۔ دیکھا کہ بیچ میں صرف ایک تختہ، جزیرہ کی مانند خشک ہے اور چاروں طرف اس زور کی بارش ہوئی ہے کہ ندی نالے بہہ رہے ہیں۔

دیگوں کے پکنے کا سلسلہ جاری تھا۔ برہمنوں نے دل میں اس کرشمہ کو کچھ مانا کچھ نہ مانا۔ وہ اب بھی یہ سوچ رہے تھے کہ ابھی تو کھانا ختم ہونے تک بہت کچھ بارش ہونی ہے۔ کھانا تیار ہوا اور ہزاروں لوگ زیر آسمان کھانے کے لئے تیار ہو بیٹھے تو مشرق سے وہی موسلا دھار بارش کی دیوار بڑھتی نظر آئی۔ بابا صاحب مشرق کی طرف رُخ کئے آسمان سے ٹکٹکی لگائے کھڑے تھے۔ پھر وہی باتیں ظہور میں آئیں۔ سامنے۔ دائیں۔ بائیں۔ پیچھے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی مگر یہ زمین کا ٹکڑا ایک جزیرہ کی طرح بارش سے محفوظ تھا۔ لوگوں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا اور حیرت سے اس تماشہ کو دیکھتے رہے اور جے بابا جی کے نعرے لگاتے رہے اس طرح وہاں کے برہمنوں نے اس کرامت کو اچھی طرح دیکھ لیا۔ دو دفعہ اس مقام کے ارد گرد بارش نہ ہوئی۔ اس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہ تھی۔ اگر ایک دفعہ ایسا ہوتا تو یہ کہہ کر دل بہلا لیتے کہ اتفاق کی بات تھی۔ مگر دو دفعہ بالکل ان ہی حالات میں اس طریقہ کی چھتری سی بن جانا شکی سے شکی کو بھی یقین دلانے کے لئے کافی تھا۔ اگر بارش ہر طرف سے رُک جاتی تو بھی کسی شبہ کی گنجائش تھی مگر صرف اس تختہ زمین پر بارش کا دو مرتبہ نہ ہونا حیرت کا مقام تھا۔ آخر وہ کون سی چھتری تھی جس نے اس نین فرلانگ کے احاطہ کو ڈیرے کی طرح محفوظ رکھا۔ سب برہمن قائل ہو گئے اور سر کے بل قبلہ بابا صاحب کے قدموں پر جا پڑے اور بہت خوشیاں منائیں۔ بابا صاحب نے کہا جائو جائو جلدی گھروں کو چلے جائو۔ بارش آرہی ہے۔ ابھی لوگ اپنے جوتے بھی سنبھالنے نہ پائے تھے کہ پھر مشرق سے اسی زور کے ساتھ بارش آئی اور سارے تختہ کو ایسے دھو ڈالا کہ نیچے گرے ہوئے کھانے اور پتے جھاڑو سے جھاڑنے کی طرف صاف ہو گئے اور سارا تختہ دُھل کر پاک و صاف نظر آنے لگا۔ سب برہمن اور مخلوق واپسی میں اس بارش سے بھیگے تو ضرور مگر وہ ایسا محسوس کر رہے تھے کہ گویا یہ فیضان ان کے قلوب پر ہو رہا ہے۔ برسوں تک اس بارش کا چرچا دور دور تک ہوتا رہا۔

ناریل کا درخت:

حجرۂ مبارک سے کوئی آدھے میل کے قریب باغ کے کنارے ایک کنواں ہے۔ اس کنوئیں سے ملا ہوا ایک ناریل کا درخت تھا۔ بابا صاحب نے جس دن سے میٹے پر قیام کیا۔ صبح اور شام غسل فرمانے کے لئے اسی کنوئیں پر تشریف لے جاتے تھے اور اس ناریل کے درخت کے کنارے خوب جی بھر کر غسل فرماتے تھے۔ ۱۹۲۲ء کا واقعہ ہے کہ ایک صبح کو جس وقت اس باغ کا مالی اور دو تین اور لوگ موجود تھے بابا صاحب نے ناریل کے درخت کی طرف غور سے دیکھا اور مالی سے پوچھا کہ یہ درخت شاخ کیوں نہیں دیتا۔ مالی نے ہنس کر جواب دیا کہ بابا کہیں ناریل کے درخت کی بھی شاخیں ہوتیں ہیں۔ بابا صاحب نے کہا کہ کیوں نہیں۔ دیکھو اسی درخت کی شاخ پھوٹے گی۔ مالی اور دوسرے لوگ یہ سُن کر چپ ہو رہے۔ پندرہ دن کے بعد مالی بابا صاحب کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ بابا آپ تو کہتے تھے کہ اس درخت کی شاخ پھوٹے گی اور وہ تو مر رہا ہے۔ بابا صاحب نے پوچھا کہ کیا ہوا۔ مالی نے بتایا کہ اس درخت کے پتے سب اوپر سے

سمٹ کر سُکڑ گئے ہیں جیسے بند گو بھی ہوتی ہے۔ بابا صاحب نے کچھ دیر کے لئے آنکھیں بند کر لیں اور فرمایا تم دیکھتے جائو۔ دو ماہ بعد مالی پھر آیا اور کہنے لگا کہ اس درخت میں دو شاخیں پھوٹ رہی ہیں۔

آج بھی وہ درخت موجود ہے۔ نیچے سے کوئی پندرہ فٹ تک ایک تنا ہے۔ اس کے اوپر بالکل ایک جیسی دو شاخیں دو ہاتھوں کی طرح پھیل کر اوپر چلی گئی ہیں۔ اور خوب پھل دیتی ہیں ان پھلوں میں یہ وصف ہے کہ جہاں اور درختوں کے پھل ہرے ہوتے ہیں۔ اس کے پھل غروب آفتاب کی شعاعوں کی طرح سنہرے ہوتے ہیں۔ پھل کا چھلکا پتلا ہوتا ہے اور اندر کا پانی اور مغز نہایت شیریں۔ جن زائرین کے نصیب میں یہ پھل ہوں ان کو مِل جاتے ہیں۔ سب کو بھلا کیسے ملیں۔ فقیروں کی اصطلاح میں ناریل کے ایک خاص معنی ہوتے ہیں۔ اگر اس تختہ پر آکر لاولد بوڑھے لوگ اولاد اور نسل کی دعا لے کر فیضیاب جاتے ہیں تو تعجب کی بات کیا ہے۔

مقدر کا پلٹنا:

ایک راجہ کا اکلوتا لڑکا تھا۔ جو بڑے نازوں سے پلا مگر اس کے جنم پتر میں پنڈتوں نے یہ بات لکھ دی تھی کہ جب یہ لڑکا اکیس سال کا ہو گا تو فلاں دن فلاں وقت کالے ناگ کے کاٹنے سے مر جائے گا۔ یہ سانپ کا گنڈہ اٹل ہے اور چاہے اسی زمانہ میں لڑکے کو آپ پانی کے بیچ میں محل بنا کر رکھتے یا آگ کی دیواروں کے قلعے میں رکھئے بچ نہیں سکتا۔ پرانی کتابوں میں اس گنڈے کے متعلق اور اس کے بچنے کی تدبیریں اور ان کی ناکامیوں کے واقعات لکھے ہوئے ہیں۔ اس لڑکے کے والدین بہت پریشان تھے۔ سارے ہندوستان میں اسے لے کر گھومے ہر جوتشی، ہر رمال نے وہی بات کہی۔ ہر سادھو اور منی نے یہی کہا کہ قسمت کا لکھا اٹل ہے۔ کوئی کیا کرے۔ راجہ نے بہت سے ایگن کرانے کی کوشش کی جس سے یہ بلا دور ہو مگر ہر دفعہ یہ ہوا کہ ایگن کے دوران میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ہو گئی کہ وہ رسم پوری نہ ہونے پائی۔

جب لڑکا اس سِن کے قریب پہنچا تو اس کے والدین لڑکے کو ساتھ لے کر بابا صاحب کے پاس حاضر ہوئے۔ یہ ۲۳ء یا ۲۴ء کا واقعہ ہے۔ بابا صاحب نے سارا ماجرا سُنا اور اتنا کہا کہ ”ہو گا۔“ وہ لوگ مایوس ہو کر لوٹ گئے۔ جب وہ دن بالکل قریب آ گیا تو یہ سوچا کہ تدبیریں بیکار ہیں کم از کم اتنا کریں کہ اس کو لے جا کر بابا صاحب کے پاس چھوڑ دیں۔ جب مرنا ہی ہے تو مرے گا ضرور مگر اس کی روح کو تو کم از کم شانتی ملے گی۔ رات کو ایک بج کر کچھ منٹ پر وہ اٹل گھڑی مقرر تھی۔ لڑکے کو لے کر یہ لوگ سرِ شام ہی بابا صاحب کے پاس پہنچے۔ یہ جگہ اس وقت بدتر سے بدتر سانپوں کا مسکن تھی۔ والدین کی ہمت پر بھی آفرین ہے کہ یوں آخری دن لڑکے کو بابا صاحب کے حوالہ کیا اور صرف اتنا کہا کہ ”اب آپ جانیں۔ ہم تو اس کو چھوڑ کر گھر جا رہے ہیں۔ صبح آ کر لاش کو لے جائیں گے۔“

باباصاحب نے کوئی جواب نہ دیا۔ جب وہ چلے گئے تو سرِ شام باباصاحب نے ایک خادم کو شہر بھیج کر پانچ لالٹین اور لڑکے کی کچھ کتابیں منگوائیں۔ پھر شام کو تھوڑی دیر تک خادموں سے باتیں کرتے رہے۔ وہ لڑکا بھی وہاں بیٹھا رہا۔ اس پر کیا گزر رہی تھی، یہ تو ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے۔ جب کافی رات ہو چکی تو اس چٹان کے چاروں کونوں پر چار لیمپ رکھ دیئے گئے۔ باباصاحب خود جھونپڑی میں چلے گئے اور لڑکے سے کہا کہ تمہیں نیند تو کیا آئے گی کوشش کرو کہ پانچواں لیمپ جو درمیان میں رکھا ہے اس کی روشنی میں کچھ کتابوں سے دل بہلائو اور کوئی قصہ کہانی پڑھتے رہو کہ وقت کٹ جائے۔

صبح سویرے اس لڑکے کے ماں باپ اس خیال سے کہ لاش کو اُٹھا کر لے جانا ہے کچھ اور آدمیوں کو ساتھ لے کر آ پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ لڑکا چٹان پر ٹہل رہا ہے۔ دھندلی روشنی میں وہ اسے اپنے لڑکے کا بھوت سمجھ کر ڈرتے ڈرتے قریب پہنچے اور اس کا نام لے کر آواز دی۔ لڑکے نے جواب دیا تو انہوں نے اس کا حال پوچھا۔ لڑکے نے کہا کہ میں اچھا ہوں۔ والدین اور قریب آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ چٹان کے کنارے ایک چھ فٹ لمبا ناگ جس کے سر پر کچھ بال بھی تھے مرا پڑا ہے اور چٹان پر اِدھر اُدھر خون لگا ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سانپ نے چٹان پر سر مار مار کر اپنی جان دے دی۔ لیکن لڑکے تک نہ پہنچ سکا۔ باباصاحب بھی اسی وقت باہر آئے اور جیسے کچھ جانتے ہی نہیں، بڑے تعجب سے اس سانپ کو دیکھتے رہے۔ اور ان لوگوں سے صرف اتنا کہا کہ ”لے جائو اپنے لڑکے کو۔ خوش رہیں گے۔“

یہ ایسے واقعات ہیں کہ عقل حیرت میں رہ جاتی ہے۔ کسی مغربی تعلیم یافتہ شخص کی سمجھ میں تو یہ بات آ ہی نہیں سکتی۔ ویسے بھی موت کی گھڑی اٹل ہے اس کا علم ہونا یا نہ ہونا یہ دوسری بات ہے اور پھر اگر اس بات کو کوئی مان بھی لے کہ تقدیر اٹل ہے اور قسمت کا لکھا بدل نہیں سکتا تو پھر یہ واقعہ کیسے ہوا؟ کیا موت کی گھڑی بھی ٹل سکتی ہے؟

اقبال نے کہا ہے۔

”نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں۔“

مندرجہ بالا بیان میں سینکڑوں کرامتوں میں سے صرف چار مختلف نوعیت کی کرامات کا بیان ہے۔ مقصد اس بیان کا یہ ہے کہ بزرگانِ دین کو اپنی طرف تو نہیں، مگر اپنے پیغام کی طرف جب خلقت کو رجوع کرنا ہوتا ہے تو ایک یا دو اس قسم کی کرشمہ سازیاں دکھاتے ہیں۔ مگر یہ چودھویں صدی ہے، آنکھوں اور کانوں سے محروم۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ لوگوں کی آنکھ ہوتی ہے مگر یہ دیکھ نہیں سکتے۔ کان ہوتے ہیں مگر سُن نہیں سکتے۔ حق کا پیغام بہر حال اس زمانہ میں بھی پہچانا ہے۔ اسی سے آئے دن اس سرزمین پر کرامات کا ظہور ہوتا ہے۔

دمادم زندگی شانِ قلندر　　دمادم سوز ایمانِ قلندر

ہمہ دم کیف عرفان قلندر　　ہمہ دم شوق فرقانِ قلندر

قلندر بابا قادر شاہ قلندر　　پناہے اُمتے مثلِ پیمبر

نگاہِ برجہاں تیرہ بختے　　نگاہِ پاک برہانِ قلندر

یہ آں سوزے کہ سوزِ کن فکان است　　بسوزایں عالم تاریک اختر

دگر گوں کن زمان مائو تورا　　بہ ضربِ لا الٰہ ضربِ قلندر

قلندر ہست شان حیّ قیوم　　ھو اللہ احد اللہ اکبر

ولیؔ از بابا قادرؔ شاہ قلندر　　جہانے یافتہ دیگر قلندر

(ولی الدین)

خمخانہ وحدت میں ہشیار نہیں آتا

اس عالم حیرت میں جز یار نہیں آتا

دنیائے محبت میں کیا کام من وتو کا

منصور جو آئے بھی بے دار نہیں آتا

کہتی ہے یہ گلشن میں غنچوں کی جگر تابی

کلیوں کو یہاں کھلنا بے خار نہیں آتا

دریائے محبت میں انوار کی موجیں ہیں

بے کشتی دل کوئی اس پار نہیں آتا

کیابات ہے گلشن میں جب ذکر ترا آیا

یہ ذکر بجز چشم کو نبار نہیں آتا

دربار میں قادرؔ کے بٹتی ہے متاعِ دل

اللہ کے شیروں کو انکار نہیں آتا

(رحمن بابا)

☆...☆...☆